Negotiations 4:2 (Dec. 2024) pp. 270-286 **ISSN: 2789-293X**

جمیلہ ہاشمی اور جیلانی بانو کی ناول نگاری کا تقابلی مطالعہ

A Comparative Study of the Novelistic Craft of Jamila Hashmi and Jeelani Bano

Dr. Muhammad Afzal Butt
Chairperson of Urdu Department, GC Women University, Sialkot
m.afzal@gcwus.edu.pk

KEYWORDS

Jamila Hashmi
Jelani Bano
Urdu Literature
Critical Analysis
Feminist
Perspective
Literary Style
Character Portrayal
Socail Issues
Cultural Aspects

DATES

Received	**12-11-2024**
Accepted	**25-11-2024**
Published	**31-12-2024**

QR CODE

ABSTRACT

This research paper presents a critical analysis of the novels by two prominent Urdu authors, Jamila Hashmi and Jelani Bano. It explores their writing styles, themes, character development, and the social and cultural dimensions reflected in their works. Both authors effectively portray various aspects of women's lives, societal issues, and feminine sensitivity in their novels. The study delves into their literary techniques, language, and the psychological intricacies of their characters. The aim of this paper is to highlight the significance of these authors in Urdu literature and appreciate their contributions, helping readers gain a deeper understanding of the diversity and depth in their writings.

DOI:
https://journals.mehkaa.com/index.php/negotiations/authorDashboard/submission/124

تلخیص:

جمیلہ ہاشمی اور جیلانی بانو کے ناولوں کا تنقیدی جائزہ" ایک تحقیقی مضمون ہے جو اردو ادب کی دو اہم مصنفات، جمیلہ ہاشمی اور جیلانی بانو کے ناولوں کا تجزیہ پیش کرتا ہے۔ اس مضمون میں دونوں مصنفات کے فنِ تحریر، موضوعات، کردار نگاری، اور سماجی و ثقافتی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جمیلہ ہاشمی اور جیلانی بانو نے اپنے ناولوں میں خواتین کی زندگی کے مختلف پہلوؤں، معاشرتی مسائل اور نسوانی حساسیت کو مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اس تحقیقی جائزے میں ان کے ادبی اسلوب، زبان و بیان، اور کرداروں کی نفسیاتی پیچیدگیوں کا بھی تفصیلی مطالعہ کیا گیا ہے۔ مضمون کا مقصد اردو ادب میں ان مصنفات کی اہمیت اور ان کے ادبی کارناموں کی قدردانی کرنا ہے تاکہ قارئین ان کی تحریروں کے تنوع اور گہرائی کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔

آزادی سے قبل ہندوستان کی اسّی فیصد آبادی دیہات میں رہتی تھی۔ اس دور میں جاگیر دار، مہنت اور ساہو کار کو کسان اور کھیت مزدور کا معاشی استحصال کرنے کی مکمل آزادی تھی۔ آزادی کے بعد بھی پاکستان کے دیہات میں زمینداروں اور جاگیر داروں کے طبقوں کے ظلم و بربریت میں کوئی کمی نہ آئی۔ جس وجہ سے کسانوں اور زمینداروں کے درمیان طبقاتی آویزش پیدا ہو گئی۔ زراعت کے شعبے میں اصطلاحات کی ضرورت تھی جن کی مدد سے دیہات کے چھوٹے کسان اور زرعی مزدوروں کا معیار زندگی بہتر انداز میں گزر سکے لیکن اس طرف زیادہ توجہ نہ دی گئی جس سے ان لوگوں کے زندگی میں خاص تبدیلی رونما نہ ہو سکی۔

بر صغیر پاک و ہند میں جاگیر دارانہ نظام کی پہلی اینٹ انگریز نے اس وقت رکھی جب 1857ء میں پورا ہندوستان فتح کرنے کے بعد اسے طاقتور خاندانوں کی حمایت کی ضرورت پڑی۔ بہت سارے خاندانوں کو انگریز حکومت کی وفاداریوں کے عوض بڑی بڑی جاگیریں عطا کی گئیں۔ جب بر صغیر پاک و ہند کی تقسیم ناگزیر ہو گئی تو جاگیر داروں کی اکثریت نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی۔ بعد میں یہی لوگ بر سر اقتدار ہوئے۔ بانی پاکستان کی خواہش تھی کہ نوزائیدہ مملکت پاکستان میں زرعی اصلاحات جلد از جلد مکمل کر لی جائیں۔ جس کے لیے انہوں نے مسلم لیگ زرعی کمیٹی بھی قائم کی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد توقع تھی کہ جاگیر دار جو پچھلے سو سال محنت کشوں، کسانوں اور مفلسوں کا استحصال کر رہے تھے۔ ان کا محاسبہ کیا جائے گا۔ جاگیر داررنہ نظام کو زرعی اصلاحات کے ذریعے ختم کر دیا جائے گا۔ قائداعظم کی وفات کے بعد اصلاحات کا یہ سفر رک گیا جس کی سزا آج ملک کی ۷۰ فیصد آبادی بھگت رہی ہے۔ پاکستان کے دو بڑے صوبوں پنجاب اور سندھ میں اس وقت جاگیر دارانہ نظام کم و بیش ویسا ہی ہے جیسا قیام پاکستان سے قبل تھا۔ تاہم اتنی تبدیلی ضرور آئی ہے کہ اب یہی چند خاندان مقامی کے ساتھ قومی سیاست میں بھی اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

جاگیر دارانہ نظام نے پچھلے ۵۸ سالوں سے ملکی ذرائع کو یرغمال بنایا ہوا ہے۔ جب بھی اس نظام کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی، بر سر اقتدار اسی طبقے نے رکاوٹیں کھڑی کر کے اصلاحات میں ایسی تبدیلیاں کروائیں جن سے ان کی جاگیریں محفوظ ہو گئیں اور

آج یہ لوگ نسل در نسل محنت کشوں کا استحصال کرتے آرہے ہیں۔ پاکستان میں جتوئی، بھٹو، گردیزی، ٹوانہ، لغاری، مزاری، نواب، پیر، جونیجو، کھوڑو، بزنجو، پلیجو، پگاڑا اور مخدوم خاندان آج بھی ہزاروں ایکڑ رقبے کے مالک ہیں۔ جنوبی پنجاب اور اندرون سندھ میں جاگیر دارانہ نظام کی جھلک آج بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ ان علاقوں میں قانون بھی جاگیر دارانہ ہی چلتا ہے۔ پنچائیت، جرگے کے نام پر ہونے والے فیصلے آج تک عالمی سطح پر پاکستان کے وقار کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ انہیں روکنے والا کوئی نہیں۔ پاکستان میں اس وقت ایک اندازے کے مطابق ۷۰ فیصد آبادی جاگیر دارانہ نظام کے زیر اثر ہے۔ مختلف علاقوں کے سردار، جاگیر دار نہ صرف ان کا استحصال کر رہے ہیں بلکہ آج اکیسویں صدی میں بھی لوگ بنیادی حقوق سے محروم ہیں۔ ہمارے ہاں آئے روز اس طرح کے واقعات سر زد ہوتے ہیں۔ جن کی بنیادی وجہ جاگیر دارانہ نظام کی خرابیاں ہوتی ہیں۔ ہم آزادی کے ۵۸ سال گزارنے کے باوجود جاگیر دارانہ نظام کے خاتمے کے لیے اصلاحات نہیں کر پائے۔

1958ء میں ایوب خان نے مارشل لاء لگایا تو انہوں نے زرعی اصلاحات کا نعرہ لگایا بعد میں ذوالفقار علی بھٹو، جنرل ضیاء الحق ،نواز شریف، اور بے نظیر بھٹو کی حکومتوں کے منشور میں بھی اس نظام کے خاتمے کو ترجیح قرار دیا گیا تھا لیکن آج تک ایسا نہیں ہو سکا۔ جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ حکومتوں میں اکثریت ان جاگیر داروں کی ہے جو کبھی بھی اپنے مفادات پر کوئی سمجھوتے کرنے کے لئے تیا ر نہیں ہو سکتی۔ اسلام نے جاگیر داری نظام کی حوصلہ شکنی کی ہے۔ حتیٰ کہ بٹائی نظام کو بھی غیر شرعی قرار دیا جاتا ہے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں ہم نہ تو اسلامی قوانین کو نافذ کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں اور نہ ہی جدید جمہوری نظام کی خوبیاں ہمارے نظام کا حصہ بن سکی ہیں۔

58 سال گزر چکے ہیں۔ ابھی تک جاگیر داری نظام کے چنگل سے نجات حاصل نہیں کر سکے معلوم نہیں جاگیر دارانہ سماج کب تک یونہی کسانوں اور مزدوروں کا استحصال کرتا رہے گا۔ یہ حقیقت ہے کہ پاکستان میں چند خاندان ۷۰ فیصد آبادی کے وسائل پر قابض ہیں اور انہیں پچھلے ڈیڑھ سو سال سے یرغمال بنائے ہوئے ہیں۔ جاگیر داروں کے استحصال کو ختم کرنے کے لیے کی گئی تمام کوششیں ہمیشہ ناکام ہوئیں جس کی وجہ پاکستان کے بڑے سیاستدان بھی ہیں۔ متعدد جاگیر دار روحانی تشخص کے حامل بھی ہیں اور انہیں۔"پیر" قرار دیا جاتا ہے۔ یہ خاندان جاگیر دار اور پیر ہونے کے ساتھ ساتھ سیاستدان بھی ہیں۔ ایسے خاندانوں میں گیلانی، گردیزی، سلطان باہو کا خاندان، پگاڑا فیملی، مخدوم، رانی پور سندھ کے سادات سر فہرست ہیں۔ سرحد میں گنڈا پور خاندان وسیع جاگیر کا مالک ہے جبکہ بلوچستان میں مزاریوں، بگٹیوں اور مریوں کا سکہ چلتا ہے۔ مگسی خاندان بھی سندھ اور پنجاب میں اثر ورسوخ کا حامل ہے۔ موجودہ اسمبلی میں بڑی تعداد انہیں خاندانوں سے تعلق رکھنے والے افراد کی ہے۔

تخلیق کے عمل میں انسانی طرز حیات کے تجربات و مشاہدات شامل ہوتے ہیں۔ تخلیق کار اپنے مشاہدات اور تجربات کی آمیزش سے واقعات کو ترتیب و تشکیل دے کر ایک لڑی میں پرو دیتا ہے کچھ واقعات اتنے شدید ہوتے ہیں کہ کردار اس کی رو میں بہتے چلے جاتے ہیں۔ جبکہ کبھی کبھار واقعہ کے پس منظر میں ماحول اور پیش منظر کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

اردو میں قیام پاکستان کے بعد چند ادیبوں نے دیہی پس منظر میں لکھے گئے ناولوں میں گاؤں کے مسائل و معاملات کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا لیکن خواتین میں جمیلہ ہاشمی اور جیلانی بانو دو نام اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں دیہاتی مسائل و معاملات پر زیادہ بہتر ڈھنگ میں روشنی ڈالی ہے۔

جمیلہ ہاشمی کا ناول "تلاش بہاراں" 1961ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں تقسیم ہند سے پہلے کی مشترکہ تہذیب کو پیش کیا گیا ہے۔ مصنفہ نے بے شمار کرداروں کی دنیا میں چند ایک کرداروں کی مدد سے ناول کے ارتقائی عمل کو فروغ دیا ہے۔ ناول کے اہم کرداروں میں کنول کماری ٹھاکر، شوبھا، راجندر اور ایک ہندو اخبار نویس شامل ہیں۔ اس ناول میں مصنفہ کی انسان دوستی کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ وہ رنگ و نسل اور مذہب و ملت سے بالاتر ہو کر انسانیت کی بقاء کے بارے میں فکر مند ہیں۔ انھوں نے اپنے اس ناول میں وسیع تجربات اور کشادہ ذہن کا ثبوت دیا ہے۔ وہ کرداروں کے ذریعے تقسیم سے قبل کے ہندوستان کے دانشور طبقے کے ذہن کی عکاسی کرتی ہیں۔ ناول میں تمام کردار ہندو ہیں بالخصوص ناول میں عورت کے کردار کو بالادستی حاصل ہے۔

کنول کماری ٹھاکر ایک بہادر باہمت اور محنتی عورت ہے۔ وہ زمانے کے نشیب و فراز سے مکمل آشنا ہے۔ اس میں خود اعتمادی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ وہ ہندوستانی عورتوں کی بقاء اور بہتری کے لیے ساری زندگی بسر کر دیتی ہے۔ وہ ایک ایسی سیاسی سماجی کارکن ہے جو صلہ اور شہرت کی تمنا سے مبرا ہے۔ وہ پہلے وکیل بنتی ہے پھر نادار گھر کا اہتمام کرتی ہے۔ اور آخر میں گرلز کالج کی پرنسپل بن جاتی ہے۔ وہ لڑکیوں میں روشن خیالی پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ اپنے نظریات کا پرچار بڑے دلکش انداز میں کرتی ہے۔ اس کا نظریہ ہے کہ عورت کی شان و شوکت سادگی اور اچھے خیالات کی مرہون منت ہے لڑکی کا زیور شرم و حیا اور بہادری ہے۔ اس نے ساری زندگی انسانیت میں انسانی قدروں کو اجاگر کرنے کے لیے وقف کر دی۔ وہ کالج کی لڑکیوں سے مذہب و ملت سے بالاتر ہو کر یکساں محبت کرتی ہے۔ اس کے خیال میں رنگ و نسل اور مذہب کی تفریق انسانیت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ وہ بلا تفریق مذہب ہر ایک کو مساوی درجہ دیتی ہے۔ اس کا واضح ثبوت اس وقت ملتا ہے جب فسادات شروع ہو جاتے ہیں۔ ہندو مسلمان لڑکیوں کی تلاش میں تمام اخلاقی اور انسانی قدروں کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ کنول کماری ٹھاکر کے تمام رات ہوسٹل میں پہرہ دیتی ہے وہ اپنے کالج کی مسلم طالبات کی عزت بچانے کے لیے جان کی بازی لگا دیتی ہے۔ اسی دوران چندر شیکھر ہوسٹل پر بم گرا دیتا ہے۔ وہ زخمی ہو کر اپاہج ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے ملک کی بگڑی ہوئی سماجی حالت سے بڑا کڑھتی ہے۔ اس کو انسانیت سے بے حد پیار ہے:

> "ملک کی حالت اتنی دگرگوں ہے۔ ہندو مسلم فسادات ہونے والے ہیں۔ کانگرس اور مسلم لیگ۔۔۔ اتنی بات۔۔۔ کیا کوئی ایسا نہیں جو ان حد بندیوں سے بلند ہو کر محض انسانیت کے لیے کام

> کرے۔ کوئی ایسا نہیں جو اپنے ذاتی مفاد کو نظر انداز کر کے صرف انسان بن کر ان سارے اختلافات کو مٹانے کی کوشش کرے۔"(1)

ایک دوسری جگہ جمیلہ ہاشمی آزادی کے خواب کی تکمیل کی دردناک حقیقت سے آگاہی دیتے ہوئے لکھتی ہیں:

> " پر کیا یہ طوفان آنے والا ہے کیا یہ انقلاب جس کا خیر مقدم ہم کرنے والے ہیں کیا یہ پر امن ہو گا۔ کیا جس آزادی کے لئے ہم نے اتنی قربانیاں کی ہیں کیا وہ پر امن ہو گی؟ انگریز ملک کو بالآخر چھوڑ رہے تھے۔ مگر یہ بے چینی کیسی؟ انھوں نے آخر میں ملک کے دو حصوں کا خواب دلوں میں ڈال دیا تھا۔ جس کے دو حصوں کو الگ کر کے نا جانے کیا ملے گا۔ مگر اس طرح ان کی اہمیت قائم رہے گی۔"(2)

کنول کماری ٹھاکر اپنے سماج میں مظلوم عورتوں کرشنا، نیرا، شوبھا اور مس کپتا وغیرہ کو دکھی دیکھ کر بڑی افسردہ ہو جاتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ سماج کے خود غرض اور بے ایمان لوگ عورت کی انفرادیت کو بھول کر اپنے اپنے فائدے کے خواہش مند ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عورتوں کی فلاح و بہبود اور اصلاح نسواں کے منصوبے بنا کر ان پر عمل پیرا ہوتی ہے۔ لڑکیوں کے ہوسٹل میں گرائے جانے والے بم سے وہ قوت بصارت سے محروم ہو جاتی ہے لیکن اس کے باوجود جرأت، ہمت اور بہادری سے کام لیتی ہے۔ اس کا کردار مثالی ہے۔ وہ قاری کو بہت متاثر کرتا ہے۔ جمیلہ ہاشمی اس کی محبت اور خلوص کو ایک عظیم عورت کے روپ میں پیش کرتی ہے:

> "کنول سن نہیں سکتی بس بول سکتی ہے اور پھر بھی اپنے بستر سے اٹھ کر دبے قدموں سارے کمرے میں گھومتی ہے۔ ٹٹول کر کھڑکیوں کو کھولتی ہے۔ باہر جھانک کر کہتی ہے یہاں کتنا اندھیرا ہے کچھ بھی تو دکھائی نہیں دیتا کیا نیرا بچیاں تو ٹھیک ہیں۔ عائشہ کو جا کر تسلی دو۔ نویدہ بہت ڈرتی ہے اس سے کہو گھبرائے نہیں۔ جب تک میں زندہ ہوں کوئی ان کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ میری زندگی میں کوئی میری بچیوں کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ مجھ سے کہتے ہیں کہ مسلمان لڑکیوں کو ان کے حوالے کر دوں، پاگل اتنا نہیں سمجھتے وہ میرا آدرش ہیں۔ وہ میرے دل کی تمنائیں ہیں وہ میرے اور باقی دنیا کی درمیاں ایک پل ہیں۔"(3)

کنول کماری ٹھاکر کا کردار پرُعزم اور ہمت و استقلال کا فطری امتزاج ہے۔ وہ سماج میں پائے جانے والے نام نہاد طبقاتی کھچاؤ کے خلاف بھرپور انداز میں آواز بلند کرتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ ایسا نظام حکومت آئے جہاں محبت، اخوت، آزادی اور مساوات کا بول بالا ہو۔ جہاں عورتوں کے تقدس کو پامال نہ کیا جائے۔ ناول کے کرداروں میں شوبھا کا کردار حقیقت کا آشکار ہے۔ اس کی شادی ہوتی ہے۔ سہاگ رات منانے سے قبل ہی اس کا شوہر سانپ کے ڈسنے سے مر جاتا ہے۔ وہ بیوہ ہو جاتی ہے۔ کچھ عرصہ بیوگی میں گزارتی ہے لیکن جلد ہی جذبات کی رو میں بہہ جاتی ہے۔ وہ اپنے میکے کو خیر آباد کہہ کر سماج کی پابندیوں سے آزاد ہونے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کی خاندانی شرافت داغ دار ہو جاتی ہے۔ وہ سماج اور مذہب کی اقدار سے بغاوت کرتی ہے۔ زندگی میں لمحاتی سکون حاصل کرنے کے لیے مختلف سہارے تلاش کرتی ہے۔ اس کا چال چلن دیکھ کر باپ موت کو گلے لگالیتا ہے۔ اور بھائی سادھو بن جاتا ہے۔ وہ

شہر پہنچ کر اخبار میں ملازمت شروع کر دیتی ہے۔ کنول کماری ٹھاکر کے نظریات کو رد کر دیتی ہے۔ اس کے خلاف مضامین لکھ کر مردوں میں شہرت حاصل کرتی ہے۔

کچھ عرصہ گزر جاتا ہے۔ وہ اپنی ڈگر پر بے خوف و خطر گامزن ہے۔ اس کی ملاقات اخبار نویس سے ہوتی ہے۔ وہ ایک شرابی سیٹھ من موہن کے ساتھ تاج محل میں سیر کرتی ہے۔ صحافی شوبھا کو کنول کماری کی شخصیت کی برتری کا احساس دلاتا ہے۔ وہ اسے طعنہ دیتا ہے جس سے اس کا ضمیر جاگ جاتا ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ اپنے خاندان اور سماج میں بگاڑ پیدا کرنے کی ذمہ دار خود ہے۔ اس میں تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ وہ کنول کمار ٹھاکر کی عظمت کا اعتراف کرتی ہے۔ اس کے نقطہ نظر کی اسیر ہو جاتی ہے۔ وہ شادی کر کے زندگی بسر کرنا شروع کر دیتی ہے۔ پروفیسر عبد السلام شوبھا میں احساس کی بیداری کے ہونے سے پہلے اور بعد کے رویہ کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

> "شوبھا نیر جی ایک آزاد خیال، آزاد طبع اور عیش پرست عورت کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ وہ کھل کر کنول کی مخالفت کرتی ہے اسے بدنام کرتی ہے مگر آخر میں اپنی غلطیوں کا اعتراف کر لیتی ہے۔ اور راوی کو خط لکھ کر کنول سے معافی کی خواستگار ہوتی ہے۔"(4)

''تلاش بہاراں'' میں کنول کماری ٹھاکر عورتوں کی مظلومی اور بے بسی کو دور کرنا ہی ہے۔ شوبھا پہلے پہل اخلاق اور معاشرتی اقدار سے بغاوت کرتی ہے لیکن بعد میں اس کی سوچ اور فکر میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ رگھو ناتھ سادھو بن جاتا ہے۔ ان سب کے علاوہ سماج میں ساس نندوں کی حشر کہانیاں بھی ملتی ہیں۔ جس میں وینا اپنے شوہر کرشن گوپال اور ساس نند کے ظلم و ستم کا نشانہ بنتی ہے۔ تمام کرداروں میں شوبھا کا کردار جاندار نظر آتا ہے۔ اس میں حقیقی زندگی کی خوبیاں اور خامیاں دونوں پائی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر سہیل بخاری تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "کتاب کا موضوع عورت کی مظلومیت ہے۔ دکھیا عورتوں کی جتنی سر گزشتیں اس ناول میں بیان کی گئی ہیں ان کا ماحصل یہی ہے کہ ہمارے سماج کی عورت بہت مظلوم ہے۔۔۔ ہندو مسلم فسادات پر ناول کا انجام غیر فطری ہے۔ اور واقعات اور سبق سے ان کا جوڑ بہت ڈھیلا ہے بلکہ اسی حصے کے باعث ناول کے مجموعی تاثر کو بھی صدمہ پہنچا ہے۔۔۔ مصنفہ نے نثر میں شاعری کرنے کی کوشش کی ہے۔ ظاہر ہے اس کوشش سے جذبائیت ہی ابھر سکتی تھی اور وہ کافی ابھر آئی ہے اس کے بیشتر مکالمے اور خطوط لمبی لمبی تقریریں ہیں اور بحثیں تمام تر مصنوعی ہیں۔"(5)

الغرض ''تلاش بہاراں'' میں عورت کی زندگی اور اس زندگی سے پیدا کردہ مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔ مصنفہ عورتوں کی کسمپرسی اور لاچاری کی حالت کو پیش کر کے عورت کے مقام و مرتبہ کا احساس دلانے کی کوشش کرتی ہیں ڈاکٹر اعجاز راہی اس ناول کے بارے میں لکھتے ہیں:

"تلاش بہاراں جمیلہ ہاشمی کا ایک ایسا ناول ہے جس میں فلسفہ حیات اور مصنفہ کا زندگی کو دیکھنے پرکھنے کا اپنا انداز فکر ایک دوسرے میں لت پت نظر آتے ہیں۔ اور خواتین کے لکھے گئے ناولوں میں قرۃ العین حیدر کے 'آگ کا دریا' کے بعد یہ ایک بڑا ناول ہے۔"(6)

''تلاش بہاراں''کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ اس میں عورتوں کی آزادی، خود مختاری، عزت اور مقام و مرتبہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ کنول کماری ٹھاکر ناول کی ہیروئن ہے لیکن اس کا کردار حقیقت سے دور مثالی کردار دکھائی دیتا ہے۔ وہ عظمت، حیثیت اور مقام و مرتبہ کے حوالے سے دیوی یا بڑی بہن محسوس ہوتی ہے۔ لیکن حقیقی عورت کے جذبات و احساسات سے عاری ہے۔ جب راجندر رادھے کشن اور ڈاکٹر بٹھاچاریہ نے کنول کماری کو عورت کے زاویہ نگاہ سے دیکھا تو انہیں شرمندگی اٹھانا پڑی۔ ایسا دکھائی دیتا ہے وہ جنسی جذبات سے بے نیاز ہو چکی ہے۔ وہ ساری عمر شادی نہیں کرتی اس کے ذہن میں یہ ہے کہ شادی کے بعد مرد کی غلامی کرنا پڑتی ہے۔ وہ نظریات کو پروان چڑھانے میں ہمہ وقت مصروف رہتی ہے۔ اس نے کالج کی لڑکیوں کو اپنے آزاد تشخص کو قائم رکھنے کی تعلیم دی ہے۔

''آتش رفتہ'' میں ایک غیر تعلیم یافتہ اور دھرتی سے جڑے ہوئے سکھ خاندان کی کہانی بیان کی ہے۔ جو توہمات پر مبنی رسومات اور شخصی وقار کے نام پر انسانوں کا خون کر دیتا ہے۔ یہ چھوٹا سا ناول ۱۶۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں گاؤں کے سکھوں کی سادہ مزاجی، رسم و رواج اور ان کی روایات کو بڑی فنکاری کے ساتھ آشکار کیا گیا ہے۔ یہ لوگ اپنے کھیتوں، گھروں اور مویشیوں کے ساتھ بڑی پُرسکون زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ اپنے ارادوں کی پختگی کی بدولت اپنی روایات کے تقدس کو پامال نہیں ہونے دیتے۔ یہ لوگ معمولی سے جھگڑے پر جان دینا اور خون بہانا اپنی شان و شوکت اور توقیر کا باعث سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی عزت و ناموس کے لیے ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہیں۔ جس کا ایک نمونہ درج ذیل اقتباس میں دکھائی دیتا ہے:

"دلدار سنگھ اس بات کا بدلہ تجھے لینا ہو گا۔ اتمے نے اپنی ماں کی بے عزتی کا بدلہ لیا اور تجھے اپنے باپ کی موت کا بدلہ لینا ہو گا۔ اسی طرح سے ہوتا آیا ہے۔ نہ کوئی بے گناہ ہوتا ہے اور نہ کوئی گناہ گار۔ یہ ماجھا ہے اور یہاں سرداروں کے خاندانوں میں پشتوں سے یہ دستور ہے۔ جس کی آن ہے۔ اس کا سب کچھ ہے۔ اتمے نے باپ کو مار کر کوئی قصور نہیں کیا اور نہ ہی تو کوئی قصور کرے گا۔"(7)

یہ ناول دلدار سنگھ کی یادوں کے وسیلے سے تخلیق ہوا ہے۔ انوپ سنگھ اور ٹھاکر مہر سنگھ دونوں دوست ہوتے ہیں۔ ایک گھوڑی کی خریداری پر دونوں کی دوستی نام نہاد سماجی وقار کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ انوپ سنگھ اپنی زمین بیچ کر پندرہ ہزار میں گھوڑی خرید لیتا ہے۔ ٹھاکر مہر سنگھ اس کا دشمن بن جاتا ہے۔ انوپ سنگھ اپنی جنسی خواہش کی تکمیل کے لیے بھاگو نامی عورت سے ناجائز تعلقات قائم کئے ہوئے ہے۔ انوپ سنگھ کی بیوی اور بیٹا اس کے اس رویے کی وجہ سے بڑے پریشان رہتے ہیں۔ ایک دن اس کے بیٹے اتم سنگھ نے انوپ سنگھ اور بھاگو دونوں کو کاٹ کر نہر میں پھینک دیا سیشن جج موقع کا گواہ نہ ہونے کی وجہ سے اتم سنگھ کو بری کر دیتا ہے

مگر ٹھاکر مہر سنگھ پرانی رنجش کی مد نظر رکھتے ہوئے اپنی زمین فروخت کر کے اسے سزائے موت دلا دیتا ہے۔ جیل میں اتم سنگھ اور اس کی ماں دونوں اتم سنگھ کے نابالغ لڑکے کے دلدار سنگھ سے وعدہ لیتے ہیں کہ دلدار سنگھ جوان ہو کر مہر سنگھ سے ضرور بدلہ لے گا۔ دلدار سنگھ جوان ہو جاتا ہے۔ اس کی سوچ فکر اور رویہ ٹھاکر مہر سنگھ اور اپنے باپ اتم سنگھ سے مختلف ہوتا ہے۔ وہ دشمنی کی بجائے دوستی کو فروغ دینے کا خواہاں ہے۔ اسے مہر سنگھ کی بیٹی کلدیپ کور عرف دیپو سے پیار ہو جاتا ہے۔ اس کی خاندانی نفرت پر اس کی محبت غالب آ جاتی ہے۔ کلدیپ کور کا بیاہ حاکم سنگھ سے ہو جاتا ہے۔ وہ مضبوط اور طاقتور نوجوان ہے۔ وہ انگلستان سے تعلیم حاصل کر کے واپس آیا ہے۔ اس کی تعلیم بھی اس کے دل و دماغ کو متاثر نہ کر سکی۔ دیپو جب اسے بتاتی ہے کہ وہ کسی اور سے پیار کرتی ہے تو وہ اپنی عزت و ناموس کی خاطر گلے میں دوپٹہ ڈال کر اسے مار دیتا ہے۔

جمیلہ ہاشمی نے ''آتش رفتہ'' میں مشرقی پنجاب کے سکھوں کی ثقافت کو بیان کیا ہے۔ یہ ناول اپنے مخصوص اسلوب، منظر نگاری، پلاٹ، کردار نگاری اور بنیادی نقطہ نظر کی وجہ سے خاص اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے پنجاب کے دیہات کی ایسی حقیقت پسندانہ عکاسی کی ہے جس میں فطرت نگاری، مصوری کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ مصنفہ جو کچھ دیکھتی ہیں اسے لفظوں میں پرو کر اردو ادب کی جان بنا دیتی ہیں۔ دیہی مناظر کو ایسے پیش کرتی ہیں جیسے قاری خود اس فضا میں سانس لے رہا ہو:

> "ہوا میں آم کے درختوں کے بور کی خوشبو تھی اور بوہل کی تازہ تازہ سوندھی باس تھی اور پھر ہرے نہر کے پانی کی ذرا سی نمی تھی۔ رہٹ چل رہا تھا اور اس کی روں روں میں مجھے دنیا کے سارے راگوں کے سر ملے ہوئے جان پڑتے تھے۔ راستے میں غبار اڑ رہا تھا۔ جو ڈوبتے سورج کی کرنوں میں سنہرا لگتا تھا۔ لوگ اپنے ڈھور ڈھنگر ہانکتے سروں پر چارے کے گٹھے لادے یا بھینسوں کی پیٹھ پر رکھے ہوئے گھروں کو جا رہے تھے اور راستے میں ماہیا گاتے جاتے تھے۔"(8)

مصنفہ کا مشاہدہ بہت تیز ہے۔ ان کی باریک بینی کی وجہ سے دیہات کا مکمل نقشہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ وہ سکھ خاندان کی تہذیب و ثقافت اور رہن سہن سے مکمل آگاہی دیتی ہیں۔ ان کے پاس ان کی زندگی کا ایک واضح شعور پایا جاتا ہے۔ وہ ایک تخلیقی فنکارہ ہیں جن کی تحریر انتہائی بے ساختہ ہے۔ قصہ کی روانی، بیان کی سادگی اور جذبات کا فطرت سے ہم آہنگ ہونا ان کی تحریر کی دلکشی ہے۔ ''آتش رفتہ'' کا درج ذیل اقتباس سکھوں کی بود و باش کا مظہر ہے:

> "ایک دن شام کو جب دادی دیے میں تیل ڈال کر بتی بٹ رہی تھی ماں چولہے میں بیٹھی اپلوں کی آگ پر روٹیاں پکا رہی تھیں اور سیلے اپلوں کے دھوئیں سے اس کی آنکھوں سے پانی نکل رہا تھا۔ جنتی چاٹی میں سے ملائی ہٹا کر دودھ کا گلاس نکال رہی تھی کہ گیانی جی کے گھر دے آئے۔ ہماری سفید بطخیں کٹ کٹ کر کے بھاگیں اور دروازے میں کسی کے ہائے ہائے کرنے کی آواز سنائی دی تو میں نے ٹوکے کو ہاتھ سے رکھ کر دروازے کی طرف دیکھا دیپو بطخوں سے ڈری سہمی کھڑی تھی نہ آگے جاتی تھی نہ پیچھے

۔۔۔ہمارے صحن میں دن کی بارش کی وجہ سے پانی اور گوبر اور گائیوں کے مُوت کی سڑ اند بھرا کیچڑ پھیلا
تھا صرف پاؤں دھرنے کی جگہ تھی جو شام کے دھندلکے میں دکھائی نہیں دیتی تھی۔"(9)

"آتش رفتہ" کے تمام کردار حقیقت کے علمبردار ہیں۔ جن میں ٹھاکر مہر سنگھ سکھ تہذیب کا نمائندہ کردار ہے۔ وہ اپنی روایات کا پاس کرتا ہے۔ وہ انوپ سنگھ کے خاندان سے انتقام لے کر اپنا سر اونچا رکھتا ہے۔ یہی اس کا دھرم ہے۔ وہ معمولی سی بات پر برسوں کی دوستی کو دشمنی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ انوپ سنگھ کی گھوڑی کا روگ اسے ساری زندگی تڑپاتا رہتا ہے۔ وہ اپنی خاندانی عزت و ناموس کے لیے اپنی ہار کو جیت میں بدلنے کے لیے بے دریغ روپیا خرچ کرتا ہے۔ کرتار کور، جو دلدار سنگھ کی دادی ہے اس کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ وہ ایک خاندانی سردارنی ہے۔ جو اپنی خاندانی شان و شوکت کے لیے سب کچھ قربان کر دیتی ہے۔ وہ زبردست قوت ارادی اور بے مثال صبر و تحمل کی مالک ہے۔ اس کا خاوند قتل ہو جاتا ہے۔ بیٹے کو پھانسی ہو جاتی ہے۔ لیکن آنکھ سے اشک تک نہیں بہتا۔ اس کی زندگی کا ایک ہی مقصد ہے، کہ اس کا پوتا دلدار سنگھ بڑا ہو کر ٹھاکر مہر سنگھ سے بدلا لے کر اسے لاٹراں میں سر اونچا کر کے چلنے کے قابل بنا دے۔ اس کی ہمت اور حوصلہ میں اس کی انتقامی سوچ نظر آتی ہے۔ بیٹے کی پھانسی کی خبر سن کر آئے ہوئے مہمانوں کو گرج کر کہتی ہے:

"دیکھو سردارنی جی سکھ سے میرا پوت زندہ ہے واہگرو خیر کرے میں کسی کو اس کی زندگی میں رونے نہیں
دوں گی اور موت پر تو کسی کا زور نہیں"۔(10)

کرتار کور اپنی خاندانی عزت اور وقار کے لیے اپنے بیٹے کی سزائے موت پر آئے ہوئے مہمانوں کی مہمان نوازی کے لیے جھالروں والے پنکھے، ٹھنڈا مشروب اور کھانا پیش کرتی ہے۔ وہ جس کرب اور دکھ سے نبرد آزما ہے وہ عام آدمی کے بس کی بات نہیں، شوہر کی موت اور بیٹے کی موت اس کے آدرشوں کے سامنے کوئی اہمیت نہیں رکھتی ہے۔ اس کی ہمت اور حوصلے کو دیکھ کر ٹھاکر مہر سنگھ بھی کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے:

" بلے بلے بھئی عورت ہے پر مردوں سے زیادہ حوصلے والی۔ دھیان پور والے ہی ایسی شیرنی پیدا کر سکتے
تھے۔ ہمارے گھر کی سوانیاں تو چوہے سے بھی ڈر جائیں۔ پردوں میں بیٹھنے والیاں جو ہوئیں۔ بھئی ہم
سردارنی کرتار کور کا مقابلہ کر سکتے ہیں بھلا۔"(11)

"آتش رفتہ" کے مردانہ اور زنانہ کرداروں نے اپنی بساط کے مطابق ناول میں اپنی اہمیت تسلیم کرائی ہے بالخصوص مردانہ کرداروں میں ٹھاکر مہر سنگھ اور زنانہ کرداروں میں کرتار کور کا کردار سکھوں کی نفسیات کے آئینہ دار ہیں۔ جس میں تاحال تبدیلی نہیں آئی ہے۔ ٹھاکر مہر سنگھ اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ اتم سنگھ، انوپ سنگھ کو نہ مارتا تو وہ خود اس کا خون کر دیتا جبکہ کرتار کور اپنے پوتے کی بدولت مہر سنگھ کے خاندان کو نیچا دکھانا چاہتی ہے۔ وہ اپنے پوتے اور دیپو کو شعوری طور پر ایک دوسرے کے قریب لاتی ہے۔ جب دیپو کی خودکشی کی خبر لاٹراں میں پہنچتی ہے تو کرتار کور کا سر فخر سے اونچا ہو جاتا ہے۔ وہ بہت خوش ہوتی ہے کیونکہ اس

کے پوتے نے دیپو کو پیار کے جھوٹے بندھن میں باندھ کر انتقام لے لیا ہے۔ دیپو کی موت کے چند دن بعد کرتار کو ریک دم موت کی طرف سفر شروع کر دیتی ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد ٹھاکر مہر سنگھ کے خاندان کو نیچا دکھانا تھا۔ جو اس کی زندگی میں ہی پورا ہو گیا تھا۔

جیلانی بانو کا ناول "بارش سنگ" 249 صفحات پر مشتمل ایک ناول ہے۔ اس میں متعدد کردار پیش کئے گئے ہیں۔ تمام کردار اپنے اپنے آدرشوں پر قائم رہتے ہیں۔ احمد، رتنا اور مالن بی ایسے کردار ہیں جو بلا چون وچرا حالات کے دھارے میں بہتے ہیں۔ مستان اور مراد ساہوکار سماج کے مستقل غلام بن چکے ہیں۔ ان کی سماج میں کوئی عزت اور وقعت نہیں۔ ان کا لباس پھٹا پرانا، رہن سہن ناقابل برداشت ہے۔ پیٹ کی بھوک مٹانے کے لئے بڑے لوگوں کا جھوٹا اور باسی کھانا کھاتے ہیں۔ زمینداروں کے ظلم بھی سہتے ہیں مگر ان کے خلاف کوئی احتجاج نہیں کرتے۔ ظلم اور جبر کے سامنے سر جھکانا ان کی عادت بن چکی ہے۔ خواجہ بی کا کردار مجبور ماں کا کردار ہے جو اپنے بچوں سمیت کنویں میں ڈوب کر ہمیشہ کے لیے استحصالی سماج سے نجات پا جاتی ہے۔ ان مجبور اور بے بس کرداروں کے الٹ بشیر علی اور رسیا کے کردار ہیں۔ انہوں نے مظلوم کسانوں اور انسانوں کو بڑے قریب سے دیکھا۔ وہ جانتے تھے کہ کسان کیسے زندگی بسر کر رہے تھے۔ وہ ظالم و جابر طبقے کے ہاتھوں کس طرح پس رہے ہیں۔ یہ دونوں دہشت پسند اور انقلابی نوجوانوں کے کردار ہیں

جیلانی بانو نے سماجی حقیقتوں کا انکشاف کیا ہے۔ انہوں نے اس میں سماج کی اقتصادی ناانصافی اور طبقاتی کشمکش کو عیاں کیا ہے۔ وہ سماج کی تمام پیچیدگیوں، غلاظتوں اور ناہمواریوں کو اپنے فن میں بڑے اچھے انداز میں پیش کرتی ہیں۔ ناول کا ہیرو سلیم ہے۔ وہ ایک کھیت مزدور ہے۔ جس کے آباؤ اجداد کے پاس بھی کبھی زمین ہوا کرتی تھی۔ لیکن زمیندار نے اپنے مہاجنی شکنجے میں قید کیا اور اب وہ بندھا ہوا مزدور بن چکا ہے۔ زمینوں کے چھن جانے کے بعد اس کی حالت بڑی ابتر ہو چکی تھی۔ گھر کے سارے افراد زمیندار کے پاس رہن تھے۔ سلیم گاؤں کے زمیندار کی استحصال پسندی اور جنسی ہوس پرستی کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ کیمونسٹ پارٹی میں شامل ہو جاتا ہے۔ حکومت اس کو دہشت گردوں کا سرغنہ قرار دے دیتی ہے۔ وہ پولیس کی گولی کا نشانہ بن جاتا ہے۔ اس کا گناہ صرف یہ تھا کہ اس نے صاحب اقتدار طبقے کی ظلم وزیادتی کے خلاف احتجاج کیا تھا۔ وہ دبے کچلے مزارعوں اور کسانوں کے حقوق کی بقاء کے لیے انھیں متحد کر رہا تھا جو زمینداروں اور ساہوکاروں کے لیے خطرہ تھا۔

اس عہد میں زمینداروں کے ساتھ ساتھ سرکاری افسران بھی ظلم وستم اور غیر اخلاقی سلوک کی انتہا کر رہے تھے۔ ان کی زندگی میں شراب اور شباب دونوں کا جلوہ نظر آتا تھا۔ وہ سرکاری غنڈہ گردی سے زمینداروں اور ساہوکاروں کی ستم ظریفیوں کے لیے راہ ہموار کرتے ہیں۔ اپنی نگرانی میں انسانیت کو ظلم کی بھینٹ چڑھا رہے تھے۔ غریب لوگوں میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ زمینداروں، ساہوکار اور افسران کی حکم عدولی کریں۔ ان کی فکر، سوچ و عمل ہر چیز پر ساہوکارانہ سماج کا غلبہ تھا۔ وہ لوگ اپنی بیویوں

اور بیٹیوں کو ہوس کی بھینٹ چڑھنے سے بچانے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ اگر کوئی اس سماجی ناانصافی کے خلاف آواز بلند کرتا تو صبح اس کی لاش کھیتوں میں نظر آتی۔ سلیم جیسے جرأت مند بے گناہ سرکاری دہشت گردی کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں۔

اس ناول میں کھیت مزدور اور کسانوں کے بنیادی مسائل اپنی پوری حقیقت کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ بے گھر مزدوروں اور کسانوں نے اس امید پر جواہر لال نہرو اور کانگرس کو ووٹ دیا تھا کہ معاشرے میں سیاسی انقلاب آنے کے بعد ان کی غربت، افلاس اور ذلت کا دور ختم ہو جائے گا لیکن کسانوں کی اقتصادی حالت اور سماجی حیثیت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ لوگوں کو روشن مستقبل کا جھانسا دے کر ووٹ حاصل کر لیتے ہیں اور بعد میں نام نہاد آزادی اور خوشحالی کا تصور غائب ہو جاتا ہے۔ کانگریس نے کسانوں اور مزدوروں کے خوابوں کو پارہ پارہ کر دیا۔

اقتدار ملنے کے بعد کانگریس زمینداروں اور سرمایہ داروں سے مفاہمت کر لیتی ہے۔ غریب عوام سے کیے گئے وعدوں سے یکسر منحرف ہو جاتی ہے۔ جاگیر دار کے جبر و تشدد کا سلسلہ اسی طرح جاری و ساری رہتا ہے۔ غریب غریب سے غریب تر اور دولت مند روز بروز خوشحال اور مستحکم ہوتا جا رہا ہے۔ ملیشیم ریڈی آصفیہ دور میں بدمعاش، حرامی اور زانی زمیندار تھا۔ ریاست حیدر آباد میں ہندوستان میں ستم ہونے پر وہ کانگرس کی حکومت میں شمولیت اختیار کر لیتا ہے۔ اور بعد میں وزیر بنا دیا جاتا ہے۔ ان کے مقابلے میں سلیم، مراد اور رسیا جیسے لوگ ساری عمر استحصال کی چکی میں پستے رہتے ہیں۔

ناول میں جیلانی بانو نے یہ بات باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ ملک میں قانون کی حیثیت کچھ بھی نہیں ہے۔ قانون کا احترام اور اس پر عمل غریب غرباء ہی کرتے ہیں۔ قانون صرف ساہوکاروں کے مفاد کا تحفظ کرتا ہے۔ قانون تو ریاست میں امن وامان اور انصاف کی بالا دستی کے لیے بنایا جاتا ہے لیکن یہاں بااثر زمیندار قانون کی دھجیاں اڑا دیتے ہیں۔ اگر کوئی غریب "مستاں" اپنی بیٹی خواجہ بی کی عزت لٹ جانے پر سیٹھ وینکٹ ریڈی کو قتل کر دیتا ہے تو وہ قانون کی گرفت میں آجاتا ہے اسے پھانسی دے دی جاتی ہے لیکن جب پاشو نواب کسی غریب کے بھائی کو درخت پر الٹا لٹکا کر ختم کر دیتا ہے تو قانون کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ قانون ان کو پکڑنے کی بجائے ان کا تحفظ کرتا ہے۔ پھر مجبوراً لوگ سماجی ناانصافی کو ختم کرنے کے لیے قانون سے بغاوت کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو باغی قرار دے دیا جاتا ہے۔ وہ دہشت پسند اور انقلابی تحریکوں کے ذریعے اپنے نظریات کو فروغ دے کر سماج کو بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مصنفہ نے ناول میں ترقی پسندانہ سیاسی نظریے کو واضح کیا ہے۔ وہ ہندوستان کے جمہوری سیاسی نظام سے مطمئن نہیں ہیں۔ وہ بخوبی جانتی ہیں یہاں کھوکھلے نعروں سے عوام کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ غریب اور عام آدمی تو دو وقت کی روٹی کے لیے تگ و دو میں مصروف ہے انتخاب لڑنا صرف ساہوکاروں اور جاگیر داروں کا کام ہے۔ اور یہ لوگ کسی بھی صورت میں غریبوں کے سچے ہمدرد نہیں ہو سکتے۔ ادیبہ نے مفلوک الحال بے گھر مزدوروں اور بے زمین کسانوں کے لیے حقیقی مسرت اور خوشحالی کے

لیے پُرتشدد سیاست کے سہارے کو لازمی قرار دیا ہے۔ وہ مفلسی، بھوک، غربت اور ظلم و ستم کے حصار سے عوام کو ہمیشہ کے لیے نجات دلانا چاہتی ہیں۔ ناول کا ایک کردار بشیر علی ان ہی نظریات کا پروردہ نمائندہ کردار ہے۔ وہ ایک خفیہ تنظیم کا سربراہ ہے۔ غریب اور نادار طبقے کے ساتھ کی گئی ظلم و زیادتیوں کا بدلہ لیتا ہے۔ وہ سرکاری افسروں اور جاگیرداروں کا دشمن ہے۔ ساہوکاروں کو معاشی طور پر کمزور کرنے کے لیے ان کی فصلوں کو راکھ کا ڈھیر بنا دیتا ہے۔ نوجوان طلبائ، وکلائ، اور دانشوروں کو بطریق احسن منظم کرتا ہے۔ اس کی چال ڈھال میں اشتراکی فلسفہ حیات کی جھلک ملتی ہے۔ وہ جمہوریت کا لبادہ اوڑھنے والے حکومتی ایوانوں میں بیٹھنے والوں پر تنقید کرتا ہے:

"سب لاریوں کے مالک۔۔۔ فیکٹریوں کے مالک سب مالکوں کے بیچ بہت اچھے ہوتے ہیں ان کی (پیک) فصل خوب لہلہاتی ہے۔ ایک کا سر کاٹو تو دوسرا سر اٹھاتا ہے۔ انہیں تو جڑ سے اکھاڑ پھینک دینا ہے۔۔۔ سیدھے راستے پر چل کر ہم بھی دیکھ لیتے ہیں۔ اب تو بیچ کی دیواریں توڑنا پڑیں گی۔ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاؤ تو بھیک ڈال دیتے ہیں۔ بس بھکاری بنے کھڑے رہو۔ ہمارے اوپر کب کسی کو رحم آئے گا۔ کب خیرات ملے گی۔ میں بولتا ہوں حکومت ہم کو کیا دی۔ کیا ملا تمھارے کو؟ دس برس ہو گئے ملک کی آزادی کو، ابھی تک تم رکشہ کھینچ رہے ہو۔"(12)

جمہوریت کا اصل مقصد تو غریب کی زندگی بہتر بنانے کے لیے طرح طرح کے منصوبے تیار کرنا ہوتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہماری جمہوریت غنڈوں، بدمعاشوں، اور غریبوں کا استحصال کرنے والوں کو تحفظ فراہم کرتی ہے۔ جس کے جواب میں بشیر علی جیسے نوجوان باغی بن جاتے ہیں۔ بشیر علی جیسے نوجوانوں کی سرکوبی کے لیے جاگیردار، ساہوکار، حکومتی افسران اور قانون یکجا ہو جاتے ہیں۔ انہیں اس بات کا ڈر ہے کہ بشیر علی کے نظریات میں عوام کی فلاح وبقا ہے جس سے ان کی شان و شوکت اور اقتدار ختم ہو جانے کا اندیشہ لاحق ہوتا ہے۔ بشیر علی پولیس سے بچنے کے لیے طرح طرح کے روپ دھارتا ہے۔ لیکن آخر بشیر علی کو پولیس گرفتار کر لیتی ہے۔ عدالت اسے پھانسی کی سزا دے دیتی ہے۔ بشیر علی ایک باہمت اور حوصلہ مند انسان ہے۔ جیل میں ملنے کے لیے اسے ہر طبقہ کے لوگ آتے ہیں۔ رکشہ ڈرائیور سے لے کر وکلاء اور کالج کے پروفیسرز، عورتیں، مرد بوڑھے، جوان سبھی شامل ہیں۔ بشیر علی سب سے ہاتھ ملاتا ہے اور بڑے فاتحانہ انداز میں کہتا ہے:

"تم لوگ رونا نہیں، میں نہیں مروں گا۔ مجھے پھانسی کے تختے پر لٹکا دو، مگر میں بار بار پیدا ہوتا رہوں گا۔ اسی طرح چلاتا رہوں گا۔۔۔ مجھے مار ڈالو۔ مگر میرے بیج میرے کھیتوں میں ضرور اگیں گے ہر سال میری پیک (فصل) کوئی نہ کوئی ضرور کاٹے گا۔"(13)

ڈاکٹر خالد اشرف ''بارش سنگ'' کو ایک نظریاتی ناول قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

"۱۹۴۷ء سے قبل کے دکن کے سیاسی و سماجی حالات بالخصوص زمینداروں کے مظالم کی عکاسی اور اس ظلم و جبر کے جواب میں چلائی گئی عوامی و اشتراکی تحریکات کی داستان اس ناول میں نہایت خوبصورتی سے

بیان کی گئی ہے۔ ناول میں آزادی کے بعد تلنگانہ کے کسانوں اور مزدوروں کے خوابوں کی شکست وریخت کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ کہ کانگرس نے اقتدار ملنے کے بعد کس طرح زمینداروں، اور سرمایہ داروں سے مفاہمت کی اور کمزور طبقوں سے کئے گئے وعدوں سے پھر کر عوام کے ساتھ غداری کی۔"(14)

جیلانی بانو کا یہ ناول اپنی فکر و فن دونوں کے اعتبار سے ہندوستان دکن کے دیہی سماج میں کسانوں، مزدوروں کے مسائل و مصائب کی عکاسی کے اعتبار سے ایک مکمل اور کامیاب ناول ہے۔ ناول کو پڑھنے کے بعد پریم چند کے ناولوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں کسانوں اور زمینداروں کی کشمکش، انگریزی حکومت کی وعدہ خلافی، ان کا ظلم و جبر اور غیر انسانی سلوک پیش کیا تھا۔ جیلانی بانو نے بھی کسانوں کے احساسات، جاگیر دارانہ طبقے کا استحصال کرنا، سب کچھ دردناک انداز میں دکھایا گیا ہے۔ پریم چند کے دور میں انگریز حکومت ساہوکاروں کی پشت پناہی کرتی تھی اور اب آزادی کے بعد ان کی اپنی سرکار ساہوکاروں کے جبر و تشدد کو فروغ دے رہی ہے۔

یہ ناول حیدر آباد کے دیہی سماج کی تصویر کشی کرتا ہے۔ ساہوکار کسانوں پر طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں۔ پولیس اور تحصیلدار کسانوں کا بڑی طرح استحصال کرتے ہیں۔ بے بس اور لاچار کھیت مزدور نسل در نسل ساہوکاروں کے غلام ہیں۔ ”بارش سنگ“ میں مظلوم اور غریب کسانوں، مزدوروں اور غریبوں کی تنہائی اور بے بسی ابھر کے سامنے آتی ہے۔ ویٹک ریڈی اور میلشیم ریڈی ہندو ساہوکار ہیں۔ صابر میاں اور نواب دلاور علی خان مسلمان جاگیر دار ہیں۔ یہ سب زندگی بھر لوگوں کا خون چوستے اور لوگوں کے گھر تباہ کرتے ہیں۔ غلامانہ زندگی کی وجہ سے دیہی کسان اور کھیت مزدوروں کے مسائل بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کی زندگی گھٹی ہوئی ہے۔ کسان کی سماجی اور معاشی زندگی کشمکش میں گھری ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ اپنی واجبی سی زندگی بھی بسر کرنے سے قاصر ہے۔ ساہوکار اور جاگیر دار انسانیت کے درجے سے گر کر درندگی پر اتر آتے ہیں۔ ان سے کسی غریب کی بہو بیٹی کی عزت محفوظ نہیں رہتی۔

جمیلہ ہاشمی اور جیلانی بانو اُردو ادب کی دو معتبر اور اہم ادبی شخصیات ہیں جنہوں نے اپنے ناولوں کے ذریعے سماجی، معاشرتی اور ثقافتی مسائل کو نمایاں کیا۔ دونوں لکھاریوں نے اپنے وقت کے معروضی حالات اور معاشرتی تصورات کو ناول کی صورت میں پیش کیا۔ اگرچہ ان کی تحریروں میں جداگانہ اسلوب ہے، لیکن ان کے موضوعات اور بیانیے میں کچھ مشترک پہلو بھی موجود ہیں۔ یہاں ہم ان دونوں کے ناولوں کا تنقیدی جائزہ پیش کریں گے۔

جمیلہ ہاشمی کے ناول حقیقت پسندی، جذباتیت اور تہذیبی شناخت کے حامل ہیں۔ ان کے ناولوں میں کرداروں کی گہرائی، قصے کی پیچیدگی اور زبان کی سادگی نمایاں ہے۔ جمیلہ ہاشمی نے معاشرتی ناہمواری، خواتین کے حقوق، اور محبت و قربانی جیسے موضوعات پر اپنی تحریروں میں روشنی ڈالی ہے۔ ان کا ناول "دشتِ سوس" تاریخی اور تہذیبی موضوعات پر مشتمل ہے، جس میں انہوں نے معاشرتی رویوں، اخلاقیات اور رسم و رواج کو بہت عمدگی سے بیان کیا ہے۔

دوسری جانب، جیلانی بانو کی تحریروں میں معاشرتی مسائل، خواتین کے حقوق، اور غربت جیسے موضوعات نمایاں ہیں۔ ان کے ناولوں میں کرداروں کے نفسیاتی پہلوؤں کا گہرا مشاہدہ موجود ہے۔ "آگ کا دریا" جیلانی بانو کا وہ ناول ہے جو تاریخ اور انسانی رشتوں کے پیچیدہ معاملات کو بیان کرتا ہے۔ ان کی تحریر میں زبان کی چاشنی اور بیانیہ کی سادگی اہم ہیں جو قاری کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

دونوں لکھاریوں کے ناولوں کا تقابلی جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جمیلہ ہاشمی نے زیادہ تر سماجی حقیقت پسندی اور تاریخی پس منظر کو اپنی تحریروں میں جگہ دی جبکہ جیلانی بانو نے معاشرتی تبدیلی اور نفسیاتی پیچیدگیوں کو اپنے ناولوں میں اُجاگر کیا۔ دونوں نے خواتین کی سماجی حیثیت پر بھی لکھا لیکن ان کے نقطہ نظر میں فرق ہے۔ جمیلہ ہاشمی نے جہاں خواتین کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں اور ان کے جدوجہد کو موضوع بنایا، وہیں جیلانی بانو نے خواتین کے نفسیاتی اور جذباتی پہلوؤں کو زیادہ اہمیت دی۔

جمیلہ ہاشمی اور جیلانی بانو کے اسلوب میں بھی نمایاں فرق موجود ہے۔ جمیلہ ہاشمی کی تحریر میں قصے کی پیچیدگی، زبان کی روانی اور تاریخی واقعات کی مرقع نگاری نظر آتی ہے جبکہ جیلانی بانو کا اسلوب زیادہ سیدھا سادہ اور نفسیاتی ہے۔ دونوں نے اپنے وقت کی معاشرتی حقیقتوں کو نہایت عمدگی سے اپنی تحریروں میں سمویا ہے، لیکن جمیلہ ہاشمی کی تحریروں میں روایتی اور کلاسیکی طرز زیادہ نمایاں ہے، جبکہ جیلانی بانو نے جدید اور نفسیاتی پہلوؤں کو زیادہ ترجیح دی۔

جمیلہ ہاشمی اور جیلانی بانو دونوں کی تحریریں اُردو ادب میں اپنی الگ الگ پہچان رکھتی ہیں۔ ان کے ناول نہ صرف سماجی اور ثقافتی مسائل کی عکاسی کرتے ہیں بلکہ قارئین کو سوچنے پر بھی مجبور کرتے ہیں۔ ان کے کردار زندہ جاوید ہیں جو ہمارے معاشرے کی حقیقی تصویر پیش کرتے ہیں۔ دونوں مصنفات نے اپنی تخلیقات کے ذریعے معاشرتی شعور بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے، اور ان کی ادبی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

المختصر اردو ادب کی دنیا میں خواتین ناول نگاروں نے اپنے منفرد اسلوب اور موضوعاتی تنوع کے ذریعے اہم مقام حاصل کیا ہے۔ جمیلہ ہاشمی اور جیلانی بانو اردو کے وہ اہم نام ہیں جنہوں نے اپنے ناولوں میں خواتین کی زندگی، سماجی ناانصافیوں، تاریخی شعور اور تہذیبی ارتقا جیسے موضوعات کو نہایت خوبصورتی اور گہرائی کے ساتھ پیش کیا۔ ان کے ناولوں کا تنقیدی جائزہ ہمیں نہ صرف ان کے تخلیقی سفر سے روشناس کراتا ہے بلکہ ان کے فن اور فکر کی مختلف جہتوں کو سمجھنے کا موقع بھی فراہم کرتا ہے۔

جمیلہ ہاشمی نے اپنے ناولوں میں تاریخ، تصوف اور خواتین کے داخلی جذبات کو بڑی مہارت سے پیش کیا۔ ان کا مشہور ناول "تشدد پر مبنی کرداروں کی کہانی" اور "دشتِ سوس" اس بات کا مظہر ہیں کہ وہ کس طرح انسانی نفسیات، تاریخی پس منظر اور روحانی موضوعات کو اپنے بیانیے کا حصہ بناتی ہیں۔

- موضوعاتی تنوع : جمیلہ ہاشمی نے برصغیر کے تاریخی حالات، تقسیمِ ہند کے المیے اور انسانی رشتوں کی پیچیدگیوں کو اپنے ناولوں میں مرکزی حیثیت دی۔
- تصوف اور علامت نگاری : ان کے ناولوں میں تصوف اور روحانیت کی جھلک نمایاں ہے، جو ان کے فکری رجحانات کو ظاہر کرتی ہے۔
- کردار نگاری : ان کے کردار گہرے اور حقیقت پسندانہ ہیں، جو قارئین کو اپنی زندگی کے حالات سے جوڑتے ہیں۔

جیلانی بانو کی ناول نگاری کا خاص پہلو ان کا سماجی شعور اور خواتین کے مسائل کی عکاسی ہے۔ ان کے مشہور ناول "ایوانِ غزل "اور "بارشِ سنگ "سماجی ناہمواریوں، طبقاتی کشمکش اور خواتین کی جدوجہد کو نہایت گہرائی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

- خواتین کے مسائل : جیلانی بانو نے اپنے ناولوں میں خواتین کے حقوق، ان کی جدوجہد اور معاشرتی پابندیوں کو موضوع بنایا۔
- طبقاتی کشمکش : ان کی تحریروں میں طبقاتی نظام اور اس کے اثرات پر خاص زور دیا گیا ہے۔
- بیانیہ اور اسلوب : جیلانی بانو کی زبان سادہ لیکن مؤثر ہے، جو قارئین کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔

دونوں مصنفات کا تقابلی جائزہ

- موضوعات : جمیلہ ہاشمی کے ناول تاریخی اور روحانی موضوعات پر مبنی ہیں، جبکہ جیلانی بانو نے سماجی مسائل اور خواتین کے حقوق پر زیادہ زور دیا ہے۔
- اسلوب : جمیلہ ہاشمی کی تحریروں میں علامتی اور فکری گہرائی نمایاں ہے، جبکہ جیلانی بانو کی زبان میں سادگی اور حقیقت پسندی پائی جاتی ہے۔
- کردار نگاری : جمیلہ ہاشمی کے کردار تاریخ اور تصوف کے رنگ میں ڈھلے ہوئے ہیں، جبکہ جیلانی بانو کے کردار روزمرہ زندگی کے مسائل کا عکس پیش کرتے ہیں۔
- ادبی مقصد : جمیلہ ہاشمی کا مقصد تاریخ اور روحانیت کو قارئین کے قریب لانا ہے، جبکہ جیلانی بانو نے سماجی اصلاح اور شعور بیدار کرنے کو اپنی تحریروں کا محور بنایا۔

جمیلہ ہاشمی اور جیلانی بانو اردو ادب کی دو اہم مصنفات ہیں جنہوں نے اپنے اپنے انداز میں اردو ناول کو نئی جہتوں سے روشناس کرایا۔ دونوں نے اپنے عہد کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے اپنے موضوعات کا انتخاب کیا اور اردو ادب کو قیمتی سرمایہ عطا کیا۔ ان کا تنقیدی جائزہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ کس طرح خواتین ناول نگاروں نے اردو ادب میں اپنے منفرد انداز اور گہرے فکری رجحانات کے ذریعے ناول کی صنف کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ اسے نئی بلندیوں تک پہنچایا۔

حوالہ جات

1. جمیلہ ہاشمی، تلاش بہاراں (کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، 1970ء)، 328۔
2. جمیلہ ہاشمی، تلاش بہاراں، 340۔
3. ایضاً، 414۔
4. عبدالسلام، ڈاکٹر، تقسیم کے بعد اردو ناول (مضمون)، اردو نثر کا ارتقا۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری، (لاہور: الوقار پبلیکیشنز، 1997ء)، 128۔
5. سہیل بخاری، ڈاکٹر، ناول نگاری اردو ناول کی تاریخ و تنقید (لاہور: مکتبہ میری لائبریری، 1966ء)، 362 تا 363۔
6. اعجاز راہی، ڈاکٹر، پاکستان میں اردو ناول (مضمون)، پاکستانی ادب۔ رشید امجد، فاروق علی (راولپنڈی: فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج، 1981ء)، 667۔
7. جمیلہ ہاشمی، آتش رفتہ (لاہور: اردو اکیڈمی سندھ، 1964ء)، 33۔
8. جمیلہ ہاشمی، آتش رفتہ، 90۔
9. ایضاً، 81۔
10. ایضاً، 51۔
11. ایضاً، 52۔
12. جیلانی بانو، بارش سنگ (کراچی: مکتبہ دانیال، کراچی، 1985ء)، 218 تا 219۔
13. جیلانی بانو، بارش سنگ، 246۔
14. خالد اشرف، ڈاکٹر، برصغیر میں اردو ناول (لاہور: فکشن ہاوس، 2005ء)، 280 تا 281۔

References in Roman Script

1. Jameela Hashmi, Talash-e-Baharan (Karachi: Urdu Academy Sindh, 1970), 328.
2. Jameela Hashmi, Talash-e-Baharan, 340.
3. Ibid, 414.
4. Abdus Salam, Dr., Taqseem ky bad Urdu Novel (Essay), Urdu Nasar ka Irtqa. Dr. Farman Fatehpuri, (Lahore: Al-Waqar Publications, 1997), 128.

5. Sohail Bukhari, Ph.D., Novel Nigari aur Urdu Novel ki Tareekh o Tanqeed (Lahore: Muktaba Meri Library, 1966), 362-363.
6. Ejaz Rahi, Ph.D., Pakistan main Urdu Novel (Essay), Pakistani Adab. Rashid Amjad, Farooq Ali (Rawalpindi: Federal Government Sir Syed College, 1981), 667.
7. Jameela Hashmi, Atish Rafta (Lahore: Urdu Academy Sindh, 1964), 33.
8. Jameela Hashmi, Atish Rafta, 90.
9. Ibid, 81.
10. Ibid, 51.
11. Ibid, 52.
12. Jilani Bano, Barash Sang (Karachi: Maktab Daniyal, Karachi, 1985), 218-219.
13. Jilani Bano, Barash Sang, 246.
14. Khalid Ashraf, Dr., Bar-e-Saqgheer main Urdu Novel (Lahore: Fiction House, 2005), 280-281.